انجمن ترقی اردو ہند
کا
ہفتہ وار اخبار

قیمت سالانہ
تین روپیہ
ایک پرچہ
تیرہ آنہ
تاریخ اشاعت
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

رجسٹرڈ نمبر
اے ۹۲۲
ٹیلیفون نمبر ۲۹
تار کا پتہ
"انجمن"
علی گڈہ

ہماری زبان

ایڈیٹر:- آل احمد سرور

جلد ۱۵ | علیگڈہ - ۲۲ دسمبر ۱۹۵٦ ع | شمارہ ۲٦

رفتارِ ادب

خلیل الرحمن اعظمی

پچھلی بیٹھک میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ اردو شاعروں کی ایک نئی نسل کچھ تازہ امکانات لے کر آئی ہے۔ یہ بات ممکن ہے بعض پختہ کار شاعروں کو بری لگی ہو کیونکہ میں نے ۱۹۳۰ء والی نسل کے اکثر شاعروں کو یہ کہتے سنا ہے کہ صاحب نئی پود میں کوئی ایسا شاعر نظر نہیں آتا جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرے۔ بعض حضرات تو یہاں تک کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ نوجوان شاعروں میں سے ابھی تک کسی نے ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں کہا ہے جو قابل ذکر ہو۔ پرانی نسل کے اس رویے سے کئی دلچسپ نتائج نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ لوگ ہر شاعری کو اپنی شاعری کے پیمانے سے ناپتے ہیں یعنی اگر نئے شاعروں کے یہاں کچھ ایسے عناصر ہیں جو بالکل نئے ہیں اور پچھلی نسل کے شعراء کا کلام ان سے خالی ہے تو یہ چیز ان کے نزدیک سرے سے "غیر شاعرانہ عنصر" ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ۱۹۳۰ء والی نسل کے اکثر شعراء ایسی شخصیتیں لے کر آئے تھے جو پندرہ بیس سال کے عرصے میں ہی اپنی تقدیر پوری کر چکیں۔ ان میں وہ جدلیاتی کیفیت نہیں ہے کہ نئے امکانات کو قبول کر کے اپنی شخصیت کو از سر نو تعمیر کر سکیں اس سے پہلے کہ میں ان نئے امکانات کو اجاگر کروں کچھ نام سن لیجئے مختار صدیقی، ضیا جالندھری، ڈاکٹر مسعود حسین، ابن انشاء، ناصر کاظمی اور بلراج کومل۔ یہ وہ شعراء ہیں جن کے مجموعے غالباً چھپ چکے ہیں۔ کچھ شاعر ایسے ہیں جن کا کلام ابھی یکجائی شکل میں نہیں آیا ہے۔ یہ ہیں حنیف، طاہر شاذ تمکنت، عبدالعزیز خالد، رضی ترمذی، وغیرہ۔ ان سارے نئے شعراء کا کلام پورے تنقیدی شعور کے ساتھ اگر کسی نے پڑھا ہے تو وہ ایک

باتیں بہت واضح طور پر سامنے آئی ہوں گی۔ سب سے پہلی خصوصیت اس نسل کی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر شعراء کے یہاں "ہندستانی مزاج" ملتا ہے جو ۱۹۳۰ء والی نسل کے بہترین شعراء کے یہاں بھی نہیں ہے۔ مجاز، جذبی، راشد اور فیض اس دور کے چند بہترین شاعروں میں سے ہیں لیکن ان کا کلام جن لوگوں نے بھی پڑھا ہے ان کو اندازہ ہوگا کہ ان سب شعراء کی لے بھی وہ ہے جس سے اب تک اردو شاعری مانوس تھی۔ مجاز اور جذبی کے یہاں تو نظموں میں بھی غزل کی روح کارفرما ہے اور موضوعات و مسائل کے نئے پن اور احساسات کی تازہ کاری کے باوجود ان کی لے اور ان کی شاعری کا مزاج اردو غزل کا مزاج ہے۔ راشد اور فیض نے ہیئت کے سلسلے میں جدید انگریزی شاعری سے استفادہ کیا اور بعض نئے رموز و علائم کو جگہ دی جس کی وجہ سے ان کے یہاں تازگی و ندرت ملتی ہے لیکن ان کا ڈکشن، ان کا مجموعی آہنگ اور ان کی شاعری کا مزاج بھی وہی ہے۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی وغیرہ نے اگرچہ زیادہ تر نظمیں ہندستان کی آزادی اور سیاسی مسائل پر کہیں ان کے یہاں بھی جوش اور ظفر علی خاں کی طرح کا لب و لہجہ ہے جس میں ہندستانی رس نہیں۔

آزادی سے قبل ہندستان جس سیاسی کشمکش کے دور سے گزر رہا تھا اس وقت ہمارے شاعروں کے لئے یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ وہ فن شعر کے سلسلے میں کوئی دور رس قدم اٹھا سکیں۔ اس وقت ہمارے شعراء کے سامنے ادبی اور تہذیبی جتنے بھی مسائل تھے اس کے پیچھے بیں الاقوامی تشنج ایک فطری امر تھا۔ لیکن آزادی کے بعد ایک طرف تو وہ طوفان تھم گیا دوسرے پوری قوم اپنی نشاۃ ثانیہ کے لئے اپنے ہزاروں برس کے تہذیبی سرمائے کا جائزہ لینے لگی اور سارے قیمتی عناصر جو اب تک تاریکی میں تھے، انہیں ان کی روشنی دیکھنے کو مل گئی۔ اس تبدیلی کا اثر ہمارے

شاعروں کے لب و لہجہ اور ان کے طرزِ فکر پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان شعراء کے یہاں ہندوستان کی مٹی کی خوشبو اور یہاں کا رس، ہندوستان کی دیو مالا، رقص، موسیقی اور لب و لہجہ کی وہ روایتیں ملتی ہیں جو مانوسیت، نرمی اور گمبھیرتا کے لئے اپنے سامنے تلسی داس، رحیم، رس خان، کبیر، میرابائی اور ٹیگور کی مثال بھی رکھتی ہے۔ پھر اردو نے اپنی صدیوں کی تاریخ میں اس آواز کو جس طرح نکھارا اور سنوارا ہے اور ہمارے پچھلے شاعروں نے جدت اور ندرت کے جو جو نمونے چھوڑے ہیں ان سب کے اثر اور امتزاج سے مجموعی طور پر نئی نسل کے شاعروں کا جو مزاج بنتا ہے وہ بڑا دلکش ہے۔ یہ اردو شاعری کے لئے ایک نیا شگون ہے اور اسے زمین سے قریب لانے کے لئے ایک صحت مند قدم۔ پچھلے دور میں انفرادی طور پر نظیر اکبرآبادی، میر تقی میر، عظمت اللہ خاں، مقبول حسین احمد پوری، میراجی، ساغر نظامی اور فراق وغیرہ نے اردو شاعری میں ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی مزاج کو سمونے کی جو کوششیں مختلف اوقات میں کی تھیں ان کے پھلنے کا وقت صحیح معنوں میں اب آیا ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ نئے شاعروں کے یہاں فطری طور پر یہ رجحان آرہا ہے۔ مختار صدیقی اور ڈاکٹر مسعود حسین کے یہاں ۱۹۴۷ء سے قبل یہ رجحان انفرادی صورت میں آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہا تھا اس کی وجہ غالباً مختار صدیقی کی کلاسیکل ہندوستانی سنگیت سے مناسبت اور ڈاکٹر مسعود حسین کی ہندی اور بنگالی ادب سے گہری واقفیت ہے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ان شعراء کو اپنے مزاج کے موافق فضا ملی اور اسی دور میں ان کے کلام کا اعتراف کیا گیا۔ اس اعتبار سے ان کے مجموعے تازہ ترین تحفے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مختار صدیقی کی عام نظموں کا لب و لہجہ اس خصوصیت کا حامل ہے لیکن ان کی طویل نظم "موہنجوداڑو" جو ۱۹۵۳ء میں لکھی گئی خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے اور اس رجحان کی کامیاب ترین مثال ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر مسعود حسین کے گیتوں کے علاوہ ان کی طویل نظم "روپ بنگال" اس دور کی نمائندہ نظم ہے۔ ابن انشا اور ناصر کاظمی کے یہاں بھی ہندوستانی مزاج اور ہندوستانی لے ہے۔ میر تقی میر کی طرف ان دونوں شعرا کا میلان ان کی "غم زدگی" کی بنا پر نہیں ہے جیسا کہ بعض تبصرہ نگاروں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا بلکہ یہ اسی نئے لہجے کی تخلیق کے سلسلے میں ایک کوشش ہے۔ اردو غزل میں میر ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو ہندستانی لب و لہجہ رکھتے ہیں اس لئے نئی نسل ان سے متاثر ہے تو یہ اس کے تنقیدی شعور کی دلیل ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس نسل کے کئی شاعر پاکستان میں بسنے کے باوجود مزاج کے اعتبار سے خالص ہندستانی ہیں۔

نئی نسل کا دوسرا اہم رجحان طویل نظموں، ڈرامائی نظموں اور فکری نظموں کا ہے۔ اس نوع کی شاعری کے لئے جذباتیت، ابال اور شدید داخلیت کے بجائے ضبط و توازن، فکری اور فلسفیانہ پس منظر اور قوت تعمیر کی ضرورت ہے۔ پچھلی نسل کے بعض بہترین شاعر مختصر نظم کے شاعر ہیں جیسے فیض، مجاز، جذبی، وغیرہ۔ بعض دوم درجے کے شعراء نے طویل نظمیں لکھنے کی کوشش کی لیکن یہ لوگ طویل نظم شاید اس نظم کو کہتے تھے جو دیکھنے میں طویل نظر آئے۔ یعنی کسی طرح کھینچ تان کر مصرعوں کی تعداد میں اضافہ کردیا جائے اس لئے ان نظموں میں ایک آدھ بند تو کام کے نکل سکے باقی نظم بے جان ہو کر رہ گئی۔

نئی نسل کے شاعروں نے کامیاب طویل نظمیں لکھی ہیں جن میں ابن انشا کی "بغداد کی ایک رات"، "اس کا آخری دن"، "شنگھائی"، "آگاد" اور "مضافات"، جعفر طاہر کی "چہار درویش"، شاذ تمکنت کی "میری زندگی میرا فن" اور "تنہا دکن"، عبدالعزیز خالد کی "تحریک مزاحمت"، ضیا جالندھری کی "نارسائی" اور رضی ترمذی کی ڈرامائی نظمیں خاص طور پر اہم ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ کے بعد ایک اور بات سمجھ میں آتی ہے کہ پچھلی نسل کے شاعروں کی طرح ہمارے نئے شاعروں نے کسی ایک موضوع ہی کو اپنا ہدف نہیں بنایا ہے بلکہ زندگی کی مختلف سمتوں میں جاکر اس کی وسعتوں کو پانے کی کوشش کی ہے اس لئے ان کے یہاں یک رنگی یا یکسر سپاٹ پن کا عیب بھی نہیں۔ تنوع، رنگارنگی اور بوقلمونی جو ہر وسیع ادب کی پہچان ہے اس طرف اب ہمارے شاعر رخ کر رہے ہیں۔ اس پر بھی اگر کسی کو نوجوان شاعروں کا ایک مصرع نہیں بھاتا تو ان سے سوائے اس کے اور کیا کہا جاتا ہے کہ ؎

ہمارا کارواں جاتا رہے تو کچھ ہوتا ہے
بہت ڈرتا ہوں میں اے میر تری دیر خوابی سے

ہماری زبان

۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ء

سوچنے کی بات

ہمارے بعض معاصرین کو ہمارے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ اردو کے لئے فضا سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ہم خوش فہمی کا شکار ہیں اور یوپی کی حکومت کے رویے پر غور نہیں کرتے اور ہمدردی کے وعدوں پر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ انہوں نے ہمارے پچھلے اداریوں کو غور سے نہیں پڑھا ورنہ شاید انہیں ہمارے نقطۂ نظر کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہوتی۔

حکومت یوپی کے رویہ کے متعلق ہم کسی خوش فہمی کے شکار نہیں ہیں۔ ہمیں اس کا تکلیف دہ احساس ہے کہ آج بھی یہ حکومت اردو کے ساتھ انصاف پر آمادہ نہیں ہوئی ہے اور اس پر نہ جواہر لال نہرو کے بار بار توجہ دلانے کا اثر ہے، نہ اردو بولنے والوں کی متفقہ آواز کا، نہ جمہوریت اور عدل کے تقاضوں کا۔ ہم سے جو ہمدردی کے وعدے کئے جاتے ہیں ہم ان سے مطمئن نہیں ہیں، ان وعدوں کے عملی جامہ پہننے کا ہمیں بے چینی سے انتظار ہے۔ ہم سادہ لوح نہیں ہیں جو ان خشک تسلیوں سے بہل جائیں۔ ہاں ہمیں اپنے ملک پر، اپنے جمہوری نصب العین پر، اس ملک کی اکثریت پر جو آج تک غلط سیاست کا شکار ہے، اپنی زبان پر اور خود اپنے خلوص اور عقیدے پر اعتماد ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یوپی میں آج سمپورنانند جی کی حکومت ہے۔ لیکن یوپی صرف سمپورنانند جی کا نہیں ہمارا بھی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ کسی اقلیت کو اگر پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے تو نہ صرف اس اقلیت کا بلکہ پورے ملک کا نقصان ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہم یہ کہنے پر مصر ہیں کہ اردو کے لئے فضا سازگار ہوتی جا رہی ہے۔ آج سے کچھ سال پہلے اردو والوں کی آواز کو اتنی توجہ سے نہیں سنا جاتا تھا، ملک کے مختلف سیاسی اور علمی حلقوں میں اردو کے اتنے ہمدرد نہ تھے۔ اردو ادب سے دلچسپی اتنی عام نہ تھی۔ آج اردو والوں کی حمایت میں ہر صوبے کے انصاف پسند لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ سب ریاستی حکومتوں کا رویہ یوپی کی حکومت کا سا نہیں ہے۔ مثلاً آندھرا پردیش کی حکومت نے اردو کے تحفظ اور بقا کے لئے جو انتظامات شروع کئے ہیں وہ قابل مبارکباد ہیں۔ فضا بہتر ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم مطمئن ہیں یا ہمیں کچھ کرنا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آج ہماری آواز زیادہ سنی جاتی ہے اور باوجود دشواریوں کے ہمارے مقاصد کے پورے ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ جو لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت یوپی ٹس سے مس نہیں ہوتی، ان سے ہم یہ گزارش کریں گے کہ تنگ نظری اور تعصب کے بادل اتنی جلد غائب نہیں ہوتے۔ اس کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ جدوجہد صرف ہنگامہ کرنے، جلوس نکالنے، جلسے کرنے اور قراردادیں پاس کرنے کا نام نہیں ہے۔ اس کے لئے لوگوں کی ذہنیت بدلنے کا پروگرام بنانا ہے۔ سیدھا سادا سوال یہ ہے کہ اردو والے اس بدلتے ہوئے ہندوستان کے لئے کس طرح مفید ہو سکتے ہیں، اس کی ترقی میں کیا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ اس کے معیار زندگی، قومی دولت، صنعتی ترقی میں کیا اضافہ کر سکتے ہیں۔ اگر کر سکتے ہیں تو ہندوستان میں اردو والوں کے ساتھ انصاف ہی نہیں فیاضی سے کام لینا ہوگا۔ اگر نہیں کر سکتے تو ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوگی۔ مانگنے کا حق انہیں کو ہے جو کچھ دے بھی سکتے ہوں۔

بہت سے اردو دوست سمجھتے ہیں کہ حکومتوں کے قوانین سب کچھ ہیں۔ یہ بڑی سادہ لوحی کی بات ہے۔ قوانین کے پیچھے ایک طاقت ہوتی ہے۔ یہ طاقت اگر جمہوریت کے دور میں اکثریت کے جذبات سے ہم آہنگ نہ ہو تو قوانین دھرے رہ جاتے ہیں۔ اردو کے لئے اگر حکومت بہتر سے بہتر قوانین بنا بھی دے تو اگر ملک کی اکثریت انہیں ماننے پر تیار نہ ہو تو یہ محض کاغذی نشان ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لئے حکومت کو اس کا فرض تو یاد دلانا ہے کیونکہ یہ ہمارا جمہوری حق ہے۔ مگر اس سے بڑا کام یہ ہے کہ حکومت کے پیچھے جو اکثریت کے ذہن کی طاقت ہے اسے متاثر کیا جائے۔ خوش قسمتی سے یہ کام ہمارا ادب کر سکتا ہے۔ اس ادب کی قدر کرنے والے، اس کی حفاظت کرنے والے، اس سے محبت رکھنے والے خاصی تعداد میں ہیں مگر یہ تعداد ابھی کافی نہیں۔ ہمیں اس تعداد کو بڑھانا ہے۔ اپنے کلاسیکل ادب کو عام کرنا ہے۔ اچھا اور عام فہم ادب پیدا کرنا ہے۔ اپنے ادب کو دوسروں کے رسم الخط میں بھی ان تک پہنچانا ہے۔ ہمیں ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی کے مبارک مشن میں تن من دھن سے شریک ہونا ہے۔ اس خدمت کے نتائج ضرور نکلیں گے۔ ایک طرف اردو زبان و ادب کی حفاظت حکومت خود کرنے پر مجبور ہوگی، دوسری طرف اردو زبان و ادب کے اچھے عناصر ہندی اور دوسری قومی زبانوں پر گہرا اثر ڈالیں گے۔ یہ زمانہ گھبرانے اور جی چھوٹا کرنے کا نہیں یقین محکم اور عمل پیہم کا ہے۔ ہماری منزل ابھی بہت دور ہے اس لئے اگر ہم ہمت ہار گئے یا غم و غصے کا شکار ہو گئے یا مایوسی نے ہمیں گھیر لیا تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ ہمیں تو ہر حال میں اپنی

جدوجہد جاری رکھنا ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں اپنے زبان و ادب کے لئے ہر مشکل کا مقابلہ کرنا ہے ملک میں سچی جمہوریت قائم ہو جائے گی تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ مگر یہ جمہوریت اسی وقت قائم ہو گی جب ہمارا عمل بھی اس کے مطابق ہوگا جب ہم اپنی تنگ نظری کو بھی نکال پھینکیں گے اور خوش دلی اور لطف کے ساتھ سارے عناصر مل کر ملک کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرم عمل ہوں گے۔

ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس

ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس نئی دہلی وگیان بھون میں اتوار ۲۳ دسمبر سے شروع ہو رہی ہے۔ ۲۴ ملکوں کو دعوت دی گئی تھی جن میں سے ۱۲ ملکوں کی شرکت کی توقع ہے سات ملکوں کے ڈیلیگیشن آچکے ہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کے ڈیلیگیشن میں جناب عبدالمجید سالک ۔ غلام مصطفیٰ تبسم ۔ فیض احمد فیض ۔ امتیاز علی تاج ۔ شوکت تھانوی ۔ عبادت بریلوی ۔ اشفاق احمد ۔ مرزا ادیب ۔ تنویر شفائی وغیرہ کے تشریف لانے کی امید ہے۔

اتوار ۲۳ دسمبر کو صبح ۹ بجے افتتاحی اجلاس ہوگا۔ دو بجے کھلا اجلاس ہوگا شام کو ۵ بجے دہلی میونسپلٹی کی طرف سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ اور چار روز تک کھلا اجلاس جاری رہے گا۔

۲۴ دسمبر کو ۶ بجے استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے کلچرل شو ہوگا ۲۵ کو شام ۵ بجے پنجابی کلا کیندر کی جانب سے سوا گت ہوگا۔ ۲۶ دسمبر کو ۶ بجے انٹرنیشنل مشاعرہ ہوگا۔ ۲۷ دسمبر کی شام کو ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے خوش آمدید کی تقریب ادا ہوگی۔ ۲۸ دسمبر کو دنیا کے ادیبوں کی گول میز کانفرنس ہوگی۔

ایشیائی کانفرنس کے انتظامات بہت پہلے سے جاری تھے۔ ہندوستان کے سرکردہ لوگوں کی ایک اسٹیرنگ کمیٹی بنا دی گئی تھی جس نے کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی سرگرمی سے کام کیا اور کانفرنس کے انتظامات میں منہمک رہے۔ توقع ہے کہ یہ کانفرنس بہت کامیاب رہے گی اس کانفرنس میں چین ، ایران ، کوریا ، مصر، نیپال ، منگولیا، روس پاکستان ، انڈونیشیا ، ویت نام ، برما ، تھائی لینڈ، سیلون وغیرہ شریک ہو رہے ہیں

انجمن کی خبریں

امروہہ (یوپی)

مقامی انجمن ترقی اردو کی نگرانی میں تعلیم بالغان کا دوسرا اسکول محلہ چاہ غوری میں بر مکان جناب قاضی سید رسول صاحب جاری ہوا۔ رسم افتتاح کے موقع پر جناب ... کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے صدر انجمن جناب حکیم کلب علی صاحب شاہد نے اسکول کی افادیت اور حیات اللہ طریق تعلیم کے ساتھ تعاون کرنے کی اپیل کی معلوم رہے کہ امروہہ میں انجمن کے زیر اہتمام یہ دوسرا اسکول ہے۔ جہاں شب میں اردو کی تعلیم بالکل مفت دی جاتی ہے اور پڑھنے لکھنے کے جملہ مصارف انجمن کی جانب سے ادا کئے جاتے ہیں

ناگور (راجستھان)

حافظ عبدالقیوم صاحب غوری جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو اطلاع دیتے ہیں:۔

یہاں ولی حضرت صوفی حمیدالدین صاحب ناگوری کے موقع پر ۲۰ دسمبر ۱۹۷۰ء سے ۲۰ دسمبر ۷۰ء تک بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ میلہ میدان میں انجمن ترقی اردو ناگور نے اپنا کیمپ لگایا اور جہاں ۲۰ دسمبر کی شب کے ۸ بجے ایک طرحی اور ۲۰ دسمبر ۷۰ء کے دن میں غیر طرحی بزم مشاعرہ زیر صدارت راجستھان کے مشہور کہنہ مشق صاحب دیوان شاعر حضرت بیدل بیکانیری (سابق ڈی جی بیکانیر اسٹیٹ) منعقد ہوئی جس میں مقامی و بیرونی تقریباً بیس شعرائے کرام نے شرکت فرما کر اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ دن کی بزم میں کلکٹر صاحب ضلع ناگور ، چیرمین میونسپل بورڈ ناگور، ایس ڈی ایم ، اکسٹرا مجسٹریٹ ، ضلع ... وکیل سونا لال جی جین و دیگر افسران شریک ہوئے۔ صاحب صدر نے ضعیف العمری کے باوجود ہر دو مجلس میں غیر طرحی کلام پیش کیا جو بیحد پسند کیا گیا۔ نیز کلکٹر ضلع ناگور نے خواہش ظاہر کی کہ ان دونوں غزلوں کی نقل مجھے دی جائے۔ انجمن نے انہیں جلد بھجوانے کا انتظام کیا کیونکہ صاحب موصوف کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا ہے۔

جے پور (راجستھان)

راجستھان کے متعدد ایم ایل اے صاحبان نے کارکنان انجمن ترقی اردو راجستھان جے پور سے تبادلہ خیالات کر کے اردو کی تعلیم پر کافی دلچسپی سے غور کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ جلد تر شروع کرائی جائے اور کل راجستھان اردو کنونشن کے منظور کردہ مطالبات کی منظوری گورنمنٹ راجستھان سے لی جائے چنانچہ ایک وفد نے جو ایم ایل اے صاحبان اور کارکنان انجمن پر مشتمل تھا۔ ایجوکیشن سکریٹری راجستھان سے وقت ملاقات طلب کیا تو جواب ملا کہ سکریٹری صاحب اردو کی تعلیم جاری

دو کرنے کا حکم عام طور تک جاری کر رہے ہیں جملہ مراحل طے ہو چکے ہیں۔ اس نے وفد کی ملاقات ملتوی رہی اور امید ہے کہ عنقریب اردو کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا اس وقت صرف شہر جے پور کے ۱۲ اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

اردو رسم خط

(۲)

از جناب سجاد مرزا صاحب حیدرآباد
متعلق: جناب ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب

سوال نمبر ۲

ہاتھ سے لکھائی اور ٹائپ سے چھپائی کے لئے الگ الگ رسم خط ضروری ہے۔ نستعلیق اردو سے وابستہ ہو چکا ہے اور مروج ہے لیکن نستعلیق کا ٹائپ جو با کفایت اور کارآمد ہو ہرگز نہیں بن سکتا اس لئے ٹائپ کی چھپائی کے لئے نسخ بلکہ نسخ سے ملتا جلتا رسم خط اختیار کرنا ہوگا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میرا کتابچہ۔ اردو رسم خط مطبوعہ ۱۹۳۰ء اس کتابچہ میں میری تجاویز کے مطابق ٹائپ تیار کرایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو منسلکہ بنیادی ٹائپ۔ اس ٹائپ فونٹ (Fount) میں کل ۱۱۲ جوڑ اور حرف اعراب اوقاف ہندسے ہیں۔ یہ اقل ترین تعداد ہے۔ کمی ناممکن ہے۔

سوال نمبر ۳

اردو ابجد کی موجودہ ترتیب برقرار رکھی جاسکتی ہے لیکن حرفوں کے ناموں کے بجائے ان کی آوازیں سکھائی جائیں۔ لکھائی سے پڑھائی آسان ہو جاتی ہے۔ اردو رسم خط ایک قسم کی مختصر نویسی ہے اس کی مناسبت سے صوتی ترتیب موزوں ہے۔

سوال نمبر ۴

مختصر نویسی اور زود نویسی اردو لکھائی کی خصوصیات ہے ان کو برقرار رکھنا اردو کے حق میں مفید ہوگا۔ اتصالی اور مکمل شکلیں ایسے رسم خط کے لئے موزوں ہیں جس میں حروف مرکبات میں بھی اپنی اصلی شکل بالعموم نہیں بدلتے۔

سوال نمبر ۵

اردو میں حروف علت نہیں ہیں۔ اس لئے اعراب کا استعمال ضروری ہے اور اس کے استعمال میں کی پیچیدگی نہ کر سہولت کا باعث ہوگی۔

سوال نمبر ۶

ہمزہ کو اعراب میں شامل کردیا جائے تو مناسب ہوگا۔ ابجد میں اس کا مقام نہیں ہے۔ انجمن ترقی اردو نے ہمزہ کی کتابت کے لئے حیدرآباد کی اردو ریڈرس کے لئے جو عمل کیا تھا اس کی مکرر جانچ کی جائے۔

سوال نمبر ۷

نون غنہ کو منفصل لکھنا غلط ہوگا۔ مروجہ طریقہ (ں) مناسب ہے

سوال نمبر ۸

ہم آواز حروف جو اردو زبان میں ان کو اردو رسم خط میں ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اردو اب مستقل زبان کا درجہ حاصل کرنے کے بعد انٹرنیشنل حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا الفاظ یا اشعار میں تاریخ نکالنا ایک صنعت ہے اور مایہ امتیاز

سوال نمبر ۹

مخلوط آوازوں کے لئے الگ حروف بے ضرورت ہیں۔

سوال نمبر ۱۰

اردو رسم خط میں تین شکلیں ہیں۔ ابتدائی۔ درمیانی۔ آخری۔ اصل پیچیدگی رسم خط میں کرسیوں کی وجہ سے ہے۔ میں نے اپنے ٹائپ میں ع کو درمیانی شکل اور ابتدائی شکل ایک رکھ کر تجربہ کیا لیکن معلوم ہوا کہ درمیانی اور مروجہ شکل سے لفظ پڑھنے میں سہولت ہے اور ایک درمیانی جوڑ کا اضافہ جب کہ کرسیوں میں کمی کردی گئی ہو باعث زحمت ہے اور نہ اس سے کچھ خاص کفایت ہوتی ہے یہ ظاہر ہے کہ لکھنے میں ع کی ابتدائی شکل اگر درمیانی شکل کے لئے استعمال کی جائے تو یہ شکل مختصر نویسی اور زود نویسی کے منافی ہوگا۔

سوال نمبر ۱۱

بیرونی زبان کے ایسے الفاظ جو قطعی طور پر زبانوں میں شامل ہوگئے ہیں ان کو ہجائی طریقہ پر لکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ ایسا کرنا یہ ثابت کریگا کہ ایسے الفاظ خارجی ہیں۔ یونیورسٹی۔ ٹریجڈی۔ پارلیمنٹ اردو میں شامل ہوچکے ہیں اور ان کا تلفظ بھی انگریزی نہیں رہا ہے۔ عربی اور فارسی میں بھی غیر زبان کے الفاظ کے لئے جو قبول کر لئے گئے ہیں۔ ہجائی طریقہ استعمال نہیں ہوتا۔

سوال نمبر ۱۲

یعنی ساکنے اور لا حقے لفظ کے ساتھ اسی وقت لکھے جائیں جب کہ صحیح تلفظ ادا ہو۔ مثلاً گل بستاں درست نہیں گلستاں صحیح ہے۔ زود نویسی کے پیش نظر انکو ملا کر لکھنا مناسب ہوگا خصوصاً جب کہ ملا کر لکھنے سے تلفظ بھی صحیح ادا ہو سکے

سوال نمبر ۱۳ :- عربی فارسی کے ایسے الفاظ جو ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں مثلاً مرہٹی، بنگالی میں شامل ہوگئے ہیں ان کو اردو تلفظ کے مطابق لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں خصوصاً جب کہ املا آسان ہو۔ جو الفاظ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں شامل نہیں ہوئے اور نہ اس کی توقع ہو ان کا املا فارسی زبان کے مطابق لکھنا مناسب ہوگا۔ ایسے الفاظ کو انٹرنیشنل تصور کرنا چاہیے۔ مثلاً اصل کو بگل لکھ کر یہ لفظ ہندی زبانوں میں شامل ہوگیا ہے۔ زکوۃ بجائے زکوٰۃ کیونکہ خود عربی میں اس کا املا زکوۃ موجود ہے۔ یہ حرف (ۃ) اردو ابجد میں نہیں ہے۔ خوش کو خُش لکھا جائے تو پیش دینا لازمی ہوگا۔ واؤ کے ساتھ خوش فارسی لکھنا ہی موزوں ہے درست ہوگا شین دو قرات بھی اردو میں نہیں ہے۔ اس لئے اصل۔ اعلیٰ کو اعلا۔ ادنا لکھنا بے جا ہے ورنہ اس کا املا بھی بگڑ گیا ہے اور انگریزی اردو ڈکشنری سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۱۴ :- یہ رسم خط سے نہیں بلکہ گرامر سے متعلق ہے جیسا کہ رسم خط جیسا ملا کر لکھا جائے گا

آخری ملاقات

ہفت روزہ اقدام لاہور نے م۔ش کے قلم سے لاہور کی ڈائری کے عنوان سے مولانا ظفر علی خاں کی ملاقات کا حال شائع کیا ہے۔ ہمعصر موصوف کے شکریے کے ساتھ آخری ملاقات کا ٹکڑا یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا سے میری آخری ملاقات گزشتہ گرمیوں میں مری میں ہوئی۔ مولانا ان دنوں پوسٹ آفس کے نزدیک اپنی کوٹھی دلکشا ن میں مقیم تھے۔ میں ایک شام سنٹرل ہوٹل سے چل کر سیدھا مولانا کی کوٹھی پر پہنچا۔ اس وقت مولانا کوٹھی کے صحن میں ایک کرسی پر تن تنہا بیٹھے تھے میں تمہید اور تکلف کے بغیر ان کے ساتھ والی پر جا کر بیٹھ گیا اور حضرت مولانا سے اپنا تعارف خود ہی کروا لیا۔ ایسے جیسے کوئی خواب سے چونکتا ہے یا جس طرح ذہن میں ایک بھولی بسری یاد تازہ ہو جاتی ہے حضرت مولانا نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پوچھا کہئے آپ کیسے ہیں؟

میں نے جواب میں مولانا سے ان کی صحت کے بارے میں پوچھا تو فرمانے لگے "اچھا ہوں" میں نے مولانا کو یک اپ کرنے کے لئے انکی کے واقعات کو ان کے سامنے دہرانا شروع کیا اور اس زمانے کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی جب پروفیسر محمد سرور کی ادارت کے زمانے میں بھی زمیندار کے ضمانت منسوخ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا کی طبیعت جولانیوں پر تھی۔ اور ہر پچھلے مہینے "زمیندار" کی ضمانت ضبط کر لی جاتی تھی۔ حضرت مولانا کے سامنے جب اس دور کے کئی لطیفے دہرائے جنھیں سن کر ان کی طبیعت گویا ہشاش بشاش ہو گئی۔

میرے ہنسنے کی آواز سن کر مولانا کے چھوٹے بھائی چودھری غلام حیدر خاں جو حضرت مولانا کی تنہائی کے واحد رفیق تھے کوٹھی سے باہر تشریف لے آئے اور ہماری گفتگو میں شریک ہو گئے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ آج بہت دنوں کے بعد مولانا کی طبیعت بشاشت کی طرف مائل ہے۔ باورچی خانے کے باہر بیٹھے ہوئے خانساماں نے بھی چودھری صاحب کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آج بہت عرصے کے بعد کھلے ہیں۔

میں نے پوچھا "حضرت مولانا کیا ان دنوں شعر بھی نازل ہوتا ہے؟" فرمانے لگے

"روح القدس نے مدت سے رُخ نہیں کیا۔" ***

ظفر علی خاں

(از مولانا حالی مرحوم)

اے مالک دفتر زمیندار	اے نازش قوم فخر اقراں
اے دیدہ روان جمع احباب	اے چشم و چراغ بزم اخواں
اے دین کے امتحاں میں جانباز	اے نصرت حق میں تیغ عریاں
اے صدق و صفا کی زندہ تصویر	اے شیر دل اے ظفر علی خاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ	اٹھا ستم و جدل کا طوفاں
ہمدردی اہل دیں نے آخر	جوہر ترے کر دئے نمایاں
غیرت و صبر کا سراسر	دامن ہوا چاک تا گریباں
پھیلے وہ بہ شکل سیل آتش	دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں
ڈالا یہ تری پکار نے غلغل	جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں
جو دل غم قوم سے تھے بے حس	چلنے لگیں ان دلوں میں چھریاں
ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ	سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں
نازاں ہے وہ دن گا تجھ پر	تعلیم پہ جس کی تو ہے نازاں
کاش ایسے بنے وہ اور فرزند	جو قوم کے درد کے ہوں درماں
سوز غم دین حق سے جن کے	سینے ہوں کباب دل ہوں بریاں
جو ملک و وطن کے ہوں فدائی	جو قوم کے نام پہ ہوں قرباں
پنجاب کو تجھ پہ ہو اگر فخر	ہے اس کو فخر و ناز شایاں

زندہ ہے وہ ملک اور ملت

ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

قلمی چہرہ

- میانہ قد
- گندمی رنگ
- بھرا ہوا بدن
- آنکھیں مانوس اور متوکل اور باوقار
- بولنے میں روانی اور بے باکی
- ورزش کے شوقین
- مسلم راجپوت

علی گڑھ کے بی۔ اے بحیثیت زمیندار کے وارث ہیں کیونکہ ان کے والد مرحوم و مغفور نے جاری کیا تھا، پنجاب کے رہنے والے۔ غیر مقلد یعنی وہابی عقیدہ رکھتے ہیں۔ عربی فارسی انگریزی اور اردو کے بہت بڑے ماہر ہیں، نظم و نثر لکھنے میں پنجاب کے پانچوں دریاؤں سے زیادہ رواں ہیں۔ وہ قادر الکلام ہیں، لیکن تادر المزاج نہیں، جھک سے اڑ جانے والی انسانی بارود ہیں۔

ان کی بول چال میں لہجہ اور تحریر میں پنجابی اثر بالکل نہیں ہوتا کیونکہ ان کی اردو عرب سے بن کر آئی ہے اور فارس کے راستے یہاں پہنچی ہے۔ جو خوب لکھتے ہیں۔ ترجمہ کرتے ہیں ان کی برابری کوئی نہیں کر سکتا۔ قادیانی ہوتے تو اپنی بے نظیر اور دل و دماغ پر نقش ہو جانے والی نظموں کو وحی و الہام کہتے۔ ہندو ہوتے تو کسی بنئے کو کنجوس نہ رہنے دیتے۔

انگریز ہوتے تو شاہ خرچی سے برٹش قوم کا دیوالہ نکال دیتے قیامت کے دن اپنی پاک نظموں کے سبب بخشے جائیں گے اور ہندوستان میں زمیندار کی قربانیوں کے طفیل آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

(خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم)

***. چودھری غلام حیدر خاں صاحب نے مجھے بتایا کہ مولانا لکھنے پڑھنے کا شغل مدت سے ترک کر چکے ہیں۔ میں صرف عادتاً انھیں اخبارات پڑھ کر سنا دیا کرتا ہوں۔

اردو دنیا

پاکستان اورینٹیل کانفرنس

پاکستان میں پہلی مرتبہ اورینٹل کانفرنس ۲۰، ۲۱ دسمبر کو ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے ادیبوں اور فاضلوں کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے ہیں اور اس اجتماع کے لئے خاص انتظامات ہو رہے ہیں۔

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو پروفیسر آل احمد سرور کو بھی دعوتی خط اور تار آئے تھے مگر ہندوستان کی ایشیائی کانفرنس اور دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے موصوف نے بہت افسوس کے ساتھ معذرت کی ہے۔

انجمن شعور ادب

مشہور افسانہ نگار سید علی عباس حسینی شاہجہانپور آئے۔ ان کے اعزاز میں عابد شاہجہاں پوری نے ایک عصرانہ دیا اور انجمن شعور ادب کی طرف سے ایک ادبی جلسہ ڈاکٹر شاہجہاں پوری کی صدارت میں اختر تلہری کے مکان پر ہوا۔ اختر تلہری کے افسانے [illegible] سے جلسے کا آغاز ہوا اس کے بعد اختر تلہری نے ایک طنزیہ مضمون "خودستائی کی ورزش" پڑھا۔ اس مضمون کے بعد حسینی صاحب نے "۵ آنسوؤں کا بار" ایک ادبی مضمون پڑھا۔ جس کے بعد مقامی شعراء نے اپنے فیر طرحی کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

ہائی کورٹ میں اردو داں جج

مدھیہ پردیش ہائی کورٹ میں اردو جاننے والے ایک جج کا تقرر حکومت کے زیر غور ہے۔ یہ بات وزیر اعلیٰ مسٹر شکلا نے ارکان اسمبلی کی کانفرنس میں اس وقت بتائی جب ان کی توجہ ایک رکن نے بھوپال سے تعلق رکھنے والے چار ہزار مقدموں کی طرف دلائی جن کا پورا ریکارڈ اردو میں ہے۔

بزم مشاعرہ

(اندیہ ٹانک) رحمانیہ کالج (دوہا دسمبر ہیں) میں ٹورنامنٹ کے خاتمے پر ایک شاندار بزم مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ جس میں مقامی اور بیرونی شعراء نے حصہ لیا۔ مشاعرہ سید اطہر حسن صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی صدارت میں ہوا جس میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور میرپور اور یافہ کی بے شمار معزز ہستیاں شریک ہوئیں۔ شعرا میں جناب [illegible] نظامی، جناب ہادی جناب تیغ باندوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

حلقہ دانشوراں بھوپال

پروفیسر ست پرکاش مشرا کے مکان پر ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار مسٹر رام لال کی صدارت میں حلقہ دانشوراں کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں کوثر چاندپوری، ست پرکاش سنگر، شفا گوالیاری، ابراہیم یوسف، ارشد صدیقی ساگری، شہاب اشرف، عزیز گوالیاری، پروفیسر مکند ترپاٹھی، ڈاکٹر ماتھر، نثری مانگور، راشیود شرما، اور کرشن دیو جوشی وغیرہ نے شرکت کی۔ سب سے پہلے کوثر چاندپوری نے رام لال صاحب کا مفصل تعارف کرایا۔ جنہوں نے حلقہ دانشوراں میں اپنی شرکت پر اظہار مسرت کیا۔ ارشد صدیقی نے گزشتہ جلسے کی کارروائی سنائی۔ تنقیدی پروگرام میں مختلف اصحاب نے حصہ لیا۔ آخر میں صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں حلقہ دانشوراں میں کی جانے والی بحث کو سراہا اور کہا کہ اس حلقے میں بہت صحت مند تنقید کی جاتی ہے اور بحث کا طریقہ بھی بہت خوبصورت ہے جس سے کسی قسم کی تلخی پیدا نہیں ہوتی۔

مجاز کی یاد میں مشاعرہ

۱۵ دسمبر کو مجاز میموریل کمیٹی کی جانب سے اسٹریچی ہال میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے فرمائی۔

حسب ذیل شعراء نے مشاعرے میں شرکت فرمائی اور اپنا کلام سنایا۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر آل احمد سرور، خلیل الرحمن اعظمی، شہاب جعفری، عرفان انصاری، سید امین اشرف، ڈاکٹر منیب الرحمن، تاباں، دعلیگ، وغیرہ

علی گڑھ میں یوم مجاز

(نامہ نگار)

۱۴، دسمبر ۱۹۶۹ء کو یوم مجاز کی تقریب کے سلسلے میں مجاز میموریل کمیٹی کی طرف سے مسلم یونیورسٹی یونین ہال میں ایک جلسہ ہوا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے جلسے کی صدارت فرمائی۔ سب سے پہلے شہاب جعفری کی بنائی ہوئی مجاز کی تصویر کی نقاب کشائی کی گئی۔

جلسے کی کارروائی مجاز کی نظم "نذر علی گڑھ" سے شروع ہوئی جسے اشتیاق محمد خاں کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی اسکول کے طلبا اور گرلز کالج کی طالبات نے ترانے کی شکل میں پیش کیا۔

مجاز کی بھتیجی محترمہ حمیدہ سالم صاحبہ نے مجاز کی یاد میں اپنا مقالہ پڑھ کر سنایا جس میں بہن کا جذبہ اثر تھا۔ حاضرین جلسہ بہت متاثر ہوئے۔ حمیدہ سالم صاحبہ کے مقالے کے بعد جناب شہاب جعفری، جناب قمر رئیس اور محترمہ شہناز ہاشمی صاحبہ کے مقالے تھے۔ جس نے حاضرین کے دل میں مجاز کی شخصی اور فنی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ ہر مقالے کے درمیان میں اشتیاق محمد خاں صاحب، باقر مہدی، بشیر حسن زیدی اور رئیس احمد صاحب نے مجاز کی غزلیں سنائیں۔

اس کے بعد جناب صدر نے پروفیسر آل احمد سرور سے تقریر کی فرمائش کی۔ سرور صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ اگرچہ مجاز نے بہت زیادہ شعر نہیں کہے۔ لیکن ان کی شاعری سنگ میل کی حیثیت

دلکشی ہے۔ ان کے یہاں رومان بھی ہے اور انقلاب بھی ہے اور اس کے پیچھے ایک سماجی انسان چھپا ہوا ہے۔ ان کی رومانیت، انقلابی تصور سے توانائی حاصل کرتی ہے۔ مجاز پوری نسل کی ترجمانی کرتے ہیں اور اسی لئے ان کا المیہ پوری نسل کا المیہ ہے مجاز نے کسی حال میں بھی زندگی کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور یہی وجہ ہے کہ ناکامی کے باوجود ان کی شاعری میں احساس ناکامی نہیں ہے ؎

یہ دیپ محفل و سیل حوادث
ہوا سرکش کہ اب بھی غم نہیں ہے

یہ لیجہ مجاز کی عظمت کا آئینہ دار ہے۔

آخر میں مسعود صاحب نے فرمایا کہ مجاز کی موت مخصوص سماجی حالات میں ہوئی۔ اور ہم اگر ان حالات کو بدل دیں تو اب بھی بہت سے مجازوں کو موت کے منھ سے بچا سکتے ہیں۔

آخر میں جناب صدر نے مجاز سے متعلق چند باتیں کہہ کر جلسہ برخاست کیا (نامہ نگار)

مجاز ـــــ جگر کی نظر میں

لکھنؤ میں یوم مجاز کے مشاعرے کی صدارت جناب جگر صاحب نے قبول فرمائی تھی۔ علالت کی وجہ سے جلسے میں تشریف نہ لے جا سکے۔ ان کا خطبۂ صدارت روشن صدیقی صاحب نے پڑھا، جس کا ایک حصہ روز نامہ قومی آواز کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

(ہماری زبان)

مجاز مرحوم کی زندگی میرے سامنے اکثر کھلی کتاب کی طرح آتی ہے ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی حیرت انگیز ترقی اور شاعری میں اپنی قدرتی صلاحیتوں کا سکہ سارے ہندستان و پاکستان پر بٹھا دیا تھا۔

ایک مختصر سے وقفہ میں ان کی نغمہ ریز آواز اور بھرپور لہجہ نے ساری ادبی دنیا کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ انھوں نے اردو شاعری میں بہت سے نئے خیالات اور جذبات کا اضافہ کیا۔ ایک نئی لے اور ترنگ کے ساتھ انھوں نے شباب اور انقلاب کا ایک ایسا حسین امتزاج پیش کیا جو اس وقت کے ادب کے لئے بالکل اچھوتی اور نئی چیز ہے

وہ نئے ادب کے معماروں اور ہندستان کے ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں میں سے ایک تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے غزل کے لب و لہجہ اور تکنیک میں کسی تبدیلی کو گوارا نہیں کیا ان کی شاعری شروع سے آخر تک ایک نیا تجربہ ہے لیکن ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے انھوں نے قدیم روایتوں سے انحراف نہیں کیا بلکہ بڑی محبت اور صدق دل کے ساتھ ان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں ان نظموں میں ان کے جذبات کی شدت کچھ کی بے ساختگی طرز ادا کا بانکپن، الفاظ کا انتخاب اسلوب کی شگفتگی اور زندگی کے شعور سے بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے کہ وہ جدید ہوتے ہوئے بھی قدیم اقدار سے ہم آہنگ تھے ان کی نظموں میں جدت ہے جوش اور ولولہ ہے۔ زمانے پر چوٹیں ہیں پھبتیاں ہیں یہاں اس کی بے رخی اور سماج کے شکوے ہیں اور بہت حد تک اس کا احساس ہے لیکن وہ زمانے کے سامنے بے بس کبھی نہیں ہوئے۔ موقع پرستوں کے ساتھ انھوں نے مفاہمت گوارا نہیں کی بلکہ زندگی کی مسلسل پریشانیوں اور پیہم شکستوں نے ان کے کردار میں شرافت نفس اور باغیانہ انقلاب کا ایک ایسا کرب مسلسل پیدا کر دیا جس میں تخریب کا سوز بھی ہے اور تعمیر کا ساز بھی ہے۔

بمبئی میں اردو

الفاروق کامٹی کی اطلاع ہے۔

بمبئی کی حکومت نے مرکزی حکومت سے کہہ کر (کیونکہ پوسٹ آفس محکمہ کے تحت تھا) یہ ضروری قرار دیا ہے کہ ہر پوسٹ کے ہرکارے (ڈاکیہ) کو اردو کا جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ بمبئی علاقے کے ڈاک کے دفتروں میں اردو کے تختے آویزاں ہیں۔ جہاں کچھ وقت ڈاکیہ مرہٹی یا ہندی کی مدد سے اردو سیکھتا ہے۔ اکثر خطوط پر اردو میں پتے لکھے ہوتے ہیں جن کو بغیر کسی دقت کے مرسل علیہ تک پہنچانے کے لئے ڈاکیوں کو اردو کی شد بد ہونی چاہئے۔ ایک عوامی اور غیر مذہبی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کو دیکھے کہ اس کے کارکن اپنی خدمات کو خوش اسلوبی سے انجام دے کر اپنے شہریوں کو سہولت پہنچاتے ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ کم اردو خواں طبقہ کی سہولت یہی ہے کہ ان کے خطوط بلا کسی تاخیر کے پہنچ جایا کریں اور یہ کام اس وقت تک خوش اسلوبی سے انجام نہیں پا سکتا جب تک کہ ڈاکیے اردو خواں نہ ہوں ہم محکمہ ڈاک و تار کو اس کے اس اقدام پر دلی مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ بھارت کی ہر ریاست کی تقلید میں اردو داں ڈاکیوں کے رکھنے پر بمبئی زور دے گی۔

بقیہ تبصرے

ـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

بیرحسن خاں اور قصص مثل امر کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ ان کتابچوں میں اس کی کمی ہے پہلے حصہ میں حل لغات سرے سے ہے ہی نہیں۔ دوسرے یہ ہے کہ کوئی تعویل کی نہیں کی گئی محض ترجمے یا تفسیر کو تشریح طریق قیم نہیں ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے کہیں کہیں حد تفسیر سے تجاوز بھی کیا ہے مثلاً ناشق اور مقامات کی تشریح میں دو ۱۰ سے یا صد کی تشریح کرتے ہوئے شیعہ سنی جھگڑے۔ حنفی وہابی فرقے۔ رضاخانی۔ دیوبندی اور بریلوی فتنے کا ذکر چھیڑ کر دے ہیں۔ شاید ان کا خیال ذوق کے اس شعر کی طرف منتقل ہوا ہو

بجتا ہے دو فریق حسد کے حسد سے ہیں
اچھا ہے یہ طریق کہ دونوں حسد سے ہیں

تاہم یہ اختلافی بحث تفسیر میں نہ آتی تو اچھا تھا۔ اس طرح کی بعض فروگذاشتیں بھی اس کے علاوہ املا کی غلطیاں بہت بھی ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں ان کو ملحوظ رکھا جائیگا بہر حال علاقہ بمبئی میں یہ اقدام بسا غنیمت اور مستحق بہت افزائی ہے۔

تبصرہ

(ضیاء احمد بدایونی)

وجدان حافظ

ایک زبان سے دوسری میں ترجمہ کرنا بظاہر معمولی بات ہے مگر دراصل بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ جب تک کوئی شخص دونوں زبانوں کا واقف کار نہ ہو اس کٹھن فرض سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے خصوصاً جب کہ کتاب زیر ترجمہ کوئی بلند پایہ ادبی شاہکار ہو اور ترجمہ بھی منظوم ہو یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان میں ادبی مصنفات تو مشہور ہوئے مگر اعلیٰ مترجم کم۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی اردو میں ایک کامیاب مترجم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھگوت گیتا، کمار سمبھو، دعید کا منظوم ترجمہ کر چکے ہیں۔ وہ لکھنوی ہونے کی بناپر زبان کا رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ادبی ذوق بہت بلند ہے جو ان کو اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے۔ زیر نظر کتاب وجدان حافظ اردو منظوم ترجمہ ہے عرفان حافظ کا جو حافظ کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ منور صاحب نے ہر جگہ لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے اور ایسا کرنا چاہیے بھی نہ تھا۔ انھوں نے اکثر حافظ کے مفہوم کو پیش کیا ہے اور محاورے کے لطف اور زبان کی صفائی کو مدنظر رکھا ہے۔ دو تین نمونے ملاحظہ ہوں۔

حافظ: خود آن کار حقیقت شود پدید — شرمندہ رہروے کہ نظر بر مجاز کرد

منور: حقیقت پاس کا جلوہ کبھی بھی جب آشکارا ہوگا — مجاز پر ہے نگاہ جس کی وہ راہرو شرمسار ہوگا (ص ۱۱)

حافظ: بہائے وصل تو گر جاں بود خریدارم — کہ جنس خوب مبصر بہ ہر چہ دید خرید

منور: یہ اپنی جان دیکر بھی ترے قرب کا طالب ہوں — تقاضائے تو لے لیتے ہیں ہر قیمت پہ چیز اچھی (ص ۱۰)

حافظ: تو بندگی چو گدایاں بہ شرط مزد مکن — کہ دوست خود روش بندہ پروری داند

منور: بھکاری کی طرح شرط جزا پر بندگی کیسی — طریقہ جانتا ہے دوست خود بندہ نوازی کا (ص ۱۲۲)

البتہ کہیں کہیں ترجمہ بہت سپاٹ اور بے لطف ہوگیا ہے۔ مثلاً

حافظ: ز چوں گفت کہ تارت بکشم می دیدم — کہ نہانش نظرے با من دل سوختہ بود

منور: زباں پر گو بظاہر یوں تھی دھمکی قتل کی دیکھا — تہ چپ چاپ سے کی پر بھی جب مجھ سے ہوئی تھی (ص ۱۳)

حافظ: من بھانم کہ فسوں سحر در چشم عشق — ہر کجیسر قدم بیکسر یا برچہ کہ ہست

منور: دعویٰ میں جب سے چشم الفت میں ہما ہوا — ہر شے پر بیٹھتا ہوں میں صفت ہزار بار (ص ۹)

ہمارا خیال ہے کہ بعض مواقع پر ادائے مفہوم میں مترجم سے لغزش ہوگئی ہے جیسے:

حافظ: بہر کس راکہ برخ خود عشق دیدی باز است — بہنسے گو بر آتش بہ کہ عاری کہ او بر آرد بش

منور: جو عشق دلبر میں یار پا نے کسو جینے کی سودہ — بہادری آگ پر دھرے کہ کرنے کے نیو داغ بہ (ص ۱۰)

خاطر پر یار ہونا اور یاد یار ہونے میں بڑا فرق ہے۔ پھر حافظ یہ نہیں کہتے کہ وہ سیاہ تن آگ پر رکھے تاکہ اس کا کاروبار چلے۔ قل رکھنے اور کاروبار چلنے میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ تیل کو خوب جل دو سے دفع نظر بد کے لئے آگ پر کود دینا رکھو۔

یا بکشش دشوار منزل یا یاد عہد آسانی کہ ترجمہ راہ منزل کی دشواری کہ آسانی کا دور آئے۔ (ص ۹۰) محل نظر ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو اچھے دن گذرے ہیں ان کی یاد میں دشواریاں برداشت کر۔ اسی طرح "فرض ایزد بگزاریم (ہیچ تقصیر ہے) کا ترجمہ "کریں ادا فرض ایزدی ہم" (ص ۷۰) صحیح قرأت اور نیز خواجہ کے کلام کے خلاف ہے۔ نیز شعر (۷) پر زہد ہم عفو و شش کا ترجمہ "نہ زہد و تقویٰ سے ہاتھ اٹھانا" بالکل برعکس ہوگیا۔ زہد فروشی سے مراد یہ ہے کہ زہد و تقویٰ پر ناز یا اس کی نمائش نہ کرنا۔

علاوہ بریں بعض جگہ سہو کتابت بھی ہے امید ہے کہ آئندہ تصحیح کر دی جائے گی۔

ان جزوی مسامحات کے باوجود کتاب قابل قدر اور کوشش لائق تحسین ہے۔ منور صاحب اردو کی خدمت کرنے اور اس کے ذخیرے کو مالا مال کرنے میں لگے رہتے ہیں اور یہ ایسا وصف ہے جس کی تعریف نہ کرنا حق پوشی ہوگی۔

آسان درس قرآن حصہ اول و دوم

مولفہ: حافظ محمد یعقوب پیش امام مسجد نیا بازار کاسگنج

قیمت ۲/۷۵ روپیہ و ۲/۰۰ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ الفاروق بک ڈپو۔ کاسگنج (ضلع ایٹہ یو۔پی)

قرآن مجید تمام مسلمانوں بلکہ انسانوں کے لئے دینی اور دنیاوی فوز و فلاح کا جامع دستور العمل ہے لیکن کتنے لوگ ہیں جو اس کو پڑھتے ہیں یا پڑھ کر سمجھتے اور عمل پیرا ہوتے ہیں۔

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب — تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہ ضرورت ہر زمانے سے زیادہ آج محسوس ہو رہی ہے کیونکہ ہماری سیکولر حکومت کا نظام ایسا ہے کہ ڈر ہے کہ آئندہ مسلمان نسلیں نہ صرف قرآن سے بلکہ اپنی زبان سے بھی جس میں ہماری تہذیب، ادب اور مذہب کا بڑا سرمایہ محفوظ ہے یکسر بیگانہ ہوں گی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے بہت سے دردمند اصحاب نے اس کی کوشش کی ہے کہ مسلمان بچے ابتدائی مذہبی تعلیم اور معمولی اردو نوشت و خواند سے آشنا ہو سکیں۔ چنانچہ ہمارے صوبہ یوپی میں مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی کی مفتاح القرآن (۲ حصے) اور دہلی میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے رسالے (تعلیم الاسلام) اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ زیر نظر دو کتابیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں اور لائق قدر کوشش ہیں۔

راہ تو بہ ہر قدم کہ پویند خوش است — نام تو بہ ہر زباں کہ گویند خوش است

مولف نے قرآن پاک کی چند چھوٹی چھوٹی سورتیں جو بیشتر نماز میں پڑھی جاتی ہیں لیکر ان کا سلیس ترجمہ درج کیا ہے اور ہر ایک کے آخر میں تفہیم کے عنوان سے ان کی تفسیر اور تشریح کی ہے کسی نئی زبان کو سکھانے کے لئے ضروری ہے کہ معلوم سے نامعلوم کی طرف پہنچنے کے لئے آسان اسباق ضروری ہیں اس لیے

مراسلات

"اُردو شاعروں اور ادیبوں سے"

محترمی! تسلیم!

ہماری زبان مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۶۶ء کے مراسلات میں گوپی چند نارنگ صاحب کا مراسلہ نظر نواز ہوا۔ مجھے جناب نارنگ کے خیالات سے مکمل اتفاق تو نہیں پھر بھی میں ان کے نیک مقصد کی مدح کا ہمنوا ضرور ہوں۔ جہاں تک مذکورہ مراسلے کے تعمیری پہلو کا تعلق ہے میں اپنے ہمزبان ادیبوں سے اور زیادہ بھرپور اور پرخلوص ہندوستانیت کو اپنے ادب میں پیدا کرنے کا تقاضا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہرچند کہ اردو کی حب الوطنی اور قومی جذبات کی ترجمانی پر شک کرنا یا اس کی ہندوستانیت کو مشتبہ سمجھنا کفر ہے لیکن اردو کے بے شمار ادیبوں کی اپنے وطن کی قومی ثقافتی اور فنی روایات سے بیگانگی کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ دورِ حاضر کے اکثر ہندوستانی ادیب یا تو فارسی و حجاز کے باشندے نظر آتے ہیں یا مغربی، سیاسی اور نفسیاتی نظریات اور جمالیاتی مفروضات کے اندھے مقلد۔ یوں تو ہندی ادیبوں کے ایک مختصر اور اہم گروہ کے مقابلے میں مغربی فارمولوں اور نظریات گزیدگی کی اندھی تقلید اور مغلوبانہ تقالی اردو ادیبوں میں کم نظر آتی ہے لیکن پھر بھی ہماری آفاقیت اور ہمہ گیری کا جذباتی سیلاب ہمیں اپنی قومی روایات سے اس قدر قریب نہیں رکھ سکا جتنے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیب ہیں جس طرح ہندی ادیبوں کی اکثریت ہندوستان کی تاریخ کے ازمنہ وسطیٰ اور دورِ جدید کے حسن فنکاری سے متعصبانہ سلوک روا رکھتی ہے اسی طرح اردو ادیب دو چار معزز و مقبول شخصیتوں کی قصیدہ خوانی سے قطع نظر اپنی تاریخ کے عہدِ قدیم سے کوئی عرفان یا استفادہ حاصل نہیں کرتے۔

آپ ہی فرمائیے کہ ہم میں اتنے کتنے ہیں جو بھرت منی، برہٹ ونڈی، بھرتری ہری، ابھینو گپتا، کنتک، وامن، رودرٹ، ابھی نو، بھوج راج وغیرہ کے شعری نظریات اور جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے آگاہ ہیں، ہم میں سے ایسے کتنے ہیں جنہیں بدھ، مہاویر، شنکر آچاریہ وغیرہ کے افکارِ عالیہ کا علم ہے یا ہم میں سے ایسے کتنے ہیں جنہیں اپنی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا مسلسل دار شعور ہے اور جو اپنی فنی روایات سے اتنے ہی واقف ہیں جتنے کہ مغربی رومانیت اور فرائیڈیت اور تاثریت سے۔

یہ تو خیر ماضی کی بات ہوئی۔ ہماری اپنی نظروں کے سامنے ہندوستان کا نقشہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ بتائیے کہ ہم نے کیا ان تاریخ ساز تبدیلیوں اور عالمگیر اثرات رکھنے والے عظیم حقائق کا پرخلوص ادراک کیا ہے اور اس ادراک کو احساسات اور تاثرات جذبات کی زبان سے بیان کیا ہے۔ ہندوستانی ادب ہمارے تین تعمیری رنگ بنیادی ہیں۔ ستیم (حقیقت)، شیوم (خیر) اور سندرم (حسن)۔ جب ہمارا ادب ان عناصرِ ثلاثہ کا موزوں اور متناسب احاطہ نہیں کرتا اور ان کے سبھی پہلوؤں کو اجاگر نہیں کرتا۔ ہم اپنے ادب کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ اب تک ہم نے ادب کو زیادہ تر تنقیدِ حیات کا روپ ہی دیا ہے۔ ادب تعمیرِ حیات ہے اور عکاسِ حقائق بھی۔ اس حقیقت کو ہم اکثر نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اپنے ادب کی آفاقیت اور کائناتی ہمہ گیری کو قائم رکھتے ہوئے اپنے ماضی حال اور مستقبل سے شعور اور عرفان حاصل کریں اور اپنے وطنی اور قومی رنگ کو خونِ جگر میں رنگ کر اپنے ادب میں رچائیں بسائیں اور سجائیں۔ ہمارا ادب انسانی ہوتے ہوئے بھی ہندوستانی ہو، ہندوستانی رہتے ہوئے بھی انسانی ہو اور ہندوستانی اور انسانی رہتے ہوئے بھی اردو ادب بنا رہے۔

ایسا کرنے میں آسانی پیدا کرنے اور سہولت بہم پہنچانے کی غرض سے انجمن ترقی اردو ہند اور دیگر ناشران کرام فن ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ سے متعلق قدیم تصانیف کے تراجم شائع کرنے کا انتظام کریں تو بہتر ہوگا۔ اس سلسلے کے مضامین اردو رسائل میں شائع ہوں تو کافی اہم کام ہوسکتا ہے۔ اسی طرح سنسکرت کے علمائے کرام کے نظریات شعر و ادب پر تقاریر کا پروگرام بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ ہمارے بعض شعرائے اور بعض محققین نے اس میدان میں مستحسن خدمت انجام دی ہے لیکن بہت ناکافی۔

ہم نے حجاز، عجم، روس، فرانس اور انگلینڈ وغیرہ کے فنی اقدار کو اپنا کر ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں گرانقدر اضافہ ضرور کیا ہے لیکن اپنی قدیم قومی روایات سے اور اپنی جدید ترقیوں اور کوششوں سے ہماری بیگانہ روی کسی طرح قابلِ تحسین قرار نہیں دی جاسکتی۔

نیاز کیش

عبدالعزیز عتیق حنفی ایم۔ اے

اردو فیسٹول

مکرمی! تسلیم!

عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا گزشتہ دو سالوں سے شاندار پیمانے پر بین کلیاتی اردو فیسٹول منا رہے ہیں۔ گزشتہ سال ہز ایکسلنسی ہین نام کرشنا راؤ گورنر کیرالا نے فیسٹول کا افتتاح فرماتے ہوئے اسے طلبا کی اچھی تہذیبی روایات قرار دیا تھا۔ اس سال طلبہ ایک نئے ماحول میں زیادہ عظیم پیمانے پر ۲۹ جنوری ۱۹۶۷ء کو اردو فیسٹول منا رہے ہیں۔ فیسٹول کے افتتاح کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد سے درخواست کی جارہی ہے۔ نیز ہندوستان بھر کے چوٹی کے شعرا اور ادیب مدعو کئے جارہے ہیں۔ یہ ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کا انفرادی فیسٹول ہوگا جسے دکن آباد کے ۲۰ سے زائد کالجوں کے اشتراک سے منایا جاتا ہے۔ اس سمپوزیم کا موضوع "لسانی ریاستوں میں اردو کے مسائل ہے"۔ ایک کل ہند مشاعرہ بھی اس موقع پر ہوگا۔

سید حسن (معتمد اردو فیسٹول)

معاصرین

(بہ سلسلہ گزشتہ)

(ادارہ نیا دور لکھنؤ)

سرور نے یہ بھی پتے کی بات کہی ہے کہ شاعر خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کرتا ہے۔ شاعری نہ صرف خواب ہے نہ کوری حقیقت، ماضی و حال کے چہرے پر نظریں جمائے رکھنے والا شاعر ایک بے بس تماشائی اور مجبور ناظر نہیں ہے وہ الجھنوں اور پریشانیوں کے ہجوم میں گھرے رہنے پر بھی مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نور امید کی ہلکی سی پھوٹتی ہوئی کرن دیکھ ہی لیتا ہے اور پھر اسی کرن کے سہارے اندھیرے گوشوں کو جگمگا کر ایسی رنگین محفلیں برپا کر دیتا ہے کہ بجھے ہوئے دل آمادہ عمل ہو جاتے ہیں اور زندگی بھٹکتی اور ٹھوکریں کھاتے کھاتے ایک نہ ایک راستہ نکال ہی لیتی ہے حقیقت کا قریب ترین جائزہ لینے کے بعد مستقبل کا جو تصور شاعر کو آمادہ عمل کرتا ہے، اسی کو سرور نے حقیقت کی حدود میں توسیع کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ خواب حقیقت سے بھی کچھ بڑھ کر یہ حقیقت کی حدیں بڑھاتا ہے۔ یعنی ادب حقیقت کی بے جان عکاسی ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت کو سنوارنے اور بدلنے کا ایک تخلیقی عمل بھی ہے۔ اس تخلیقی عمل کو صرف سود و زیاں کے سستے پیمانوں سے کیسے ناپ سکتے ہیں؟ خوف سود و زیاں تو اکثر خوابوں کو منتشر کر دیتا ہے

آل احمد سرور، ترقی پسند ناقدین میں ایک بلند درجے کے مالک ہیں اور اس حلقہ ادب کے منصب سے نمایاں ترجمان ہیں۔ انھوں نے گزشتہ بے راہ روی کے خلاف یہ آواز اٹھا کر ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ بالخصوص ان کا یہ اعلان کہ شاعری کو نعرہ بازی یا پروپیگنڈے کی ضرورت نہیں ہے۔" بہت ہی برمحل ہے۔ کافی دنوں تک نعرہ بازی کو ہی شاعری سمجھا جانے لگا تھا۔ وہ سنبھلا ہوا، نپا تلا صاف ستھرا اور دل آویز انداز جو صدیوں کی تربیت و تہذیب نے شاعری اور ادب کو عطا کیا تھا جس سے زبان و ادب کی روایتوں کی تشکیل ہوئی تھی جو ہماری قومی ثقافت کا جز بن گیا تھا اس سے گریز کر کے نعرہ بازی کو ادب کا مترادف قرار دے لینا یقیناً اول درجے کی ناانصافی تھی۔ اس نعرہ بازی کا جواز یہ بتایا جاتا تھا کہ عوامی ادب پیدا کیا جا رہا ہے اس سے بڑی خود فریبی اور کیا ہو سکتی تھی۔ سرور نے ایسے حضرات کو بھی صاف صاف لفظوں میں آگاہ کر دیا ہے کہ متوسط طبقے کے شاعر اس (عوامی ادب) کے نقش ہلکا کر سکتے ہیں، وہ خود عوامی ادب نہیں پیدا کر سکتے۔ کیونکہ عوامی ادب عوام کے دلوں کی گہرائیوں سے نکلے گا متوسط طبقے کے ہمدردوں کے اثرات سے نہیں۔

سرور نے شاعری کے بارے میں یہ مختصر بات کہہ دی ہے کہ "میں شاعری کو انسانیت کے ضمیر کی آواز سمجھتا ہوں۔ جب تک شاعری کا مطلع اتنا وسیع نہیں ہوگا، شاعری شاعری نہیں بلکہ بازی گری رہے گی۔ حقیقتہ شاعری ہو یا رزمیہ، رومانی ہو یا سیاسی، اگر اس میں آفاقیت نہیں ہے اگر اس کا محور ساری انسانیت نہیں ہے تو وہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی۔ کاش ہمارے نعرہ ساز ادیب اور شاعر انسانیت کے ضمیر کی آواز کو سن سکیں۔ اور سرور ایسے عظیم المرتبت نقاد کی طرح لبیک کہتے ہوئے دوڑ سکیں۔

زندہ باد کے نعروں میں اردو کی موت

ہم عصر ریاست ہفتہ وار دہلی اردو کے متعلق کسی نہ کسی عنوان سے تقریباً ہر ہفتے کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہے۔ اس کے لکھنے کا جو کھرا اور بے جھجک انداز ہے وہ ریاست کے دیکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ اخبار مذکور نے ۱۰ دسمبر کے ادارتی نوٹ میں اوپر کی سرخی سے آندھرا کے وزیر تعلیمات کی اس مخلصانہ تقریر کا اقتباس دیا ہے جس میں انھوں نے قدیم آندھرا سے آنے والوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب دی ہے اور اس زبان کی خوبیوں اور پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے اس کے سیکھنے کے فوائد بتائے ہیں۔ ہمیں ذاتی طور پر علم ہے کہ وزیر تعلیم آندھرا مسٹر نرسنگ راؤ بڑے اچھے کردار کے انسان ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن ایک ہے وہ جو کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔

مگر یہ برابر دیکھا جا رہا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رہنما اردو کے متعلق جتنا کہتے ہیں اتنا اثر متعلقہ لوگوں پر ہوتا نہیں۔ اگر ہوتا بھی ہے تو اتنا خفیف کہ عام نگاہوں کو محسوس نہیں ہوتا۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر صاحب موصوف نے یہ ادارتی نوٹ لکھا ہے۔ یہ ایک عام بات ہے اس کا روئے سخن کسی خاص شخصیت کی طرف نہیں ہے

(ہماری زبان)

ہندوستان میں اردو زبان کی کیفیت بھی بے حد دلچسپ ہے۔ یہ زبان ہندوستان کے کانسٹی ٹیوشن میں بطور ایک زبان کے موجود ہے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو اپنی تقریروں میں اس کو زندہ رکھنے

اور اس کو ترقی دینے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ صوبہ جات کے وزراء اس کے حق میں بیانات دیتے رہتے ہیں اور ایک لیڈر بھی ایسا نہیں جس کو اس زبان کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت ہو مگر ان بیانات اور تقریروں کی موجودگی میں بھی کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں کہ اس کو مٹانے اور اس کو موت کے گھاٹ اتارنے کی سرگرم کوششیں جاری نہ ہوں۔ چنانچہ پنجاب کی عدالتوں میں یہ زبان جاری تھی مگر اب اس کو وہاں سے نکالا جا رہا ہے پنجاب کے کروڑوں ہندو اور مسلمان یہ زبان بولتے ہیں مگر وہاں اس کو ایک علاقائی زبان نہ قرار دیا گیا۔ دہلی میں یہ پیدا ہوئی مگر اس صوبہ کے وزیراعلیٰ سردار گورمکھ نہال سنگھ یہاں وزارت اور اسمبلی کے کریا کرم کے ساتھ اس زبان کی بیین بھی پڑھ گئے اور حیدرآباد اور بھوپال اس زبان کے مراکز تھے۔ مگر وہاں بھی اس کی موت کے وارنٹ جاری ہو گئے۔ یعنی ہندوستان کے لیڈر اور وزراء اس کے حق میں زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے اس کو موت کے گھاٹ اتارتے چلے جا رہے ہیں۔ اور کوئی نہیں پوچھتا کہ اگر تم اس زبان کو ملک میں سے ختم ہی کرنا چاہتے ہو تو پھر اس کے حق میں بیانات کیوں دیتے ہو۔

اردو کی موجودہ حالت کو مرحوم سید اکبر الہ آبادی کے اس شعر سے مناسبت دی جا سکتی ہے۔ جو شعر آپ نے ۱۹۱۴ء کی جنگ کے زمانہ میں انگریزوں کی فتح کی خبروں اور جرمن افواج کے میدان جنگ میں آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ یعنی اردو زبان کے حق میں یہاں زندہ باد کے نعرے بھی بلند ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اس زبان کا جنازہ بھی اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ کاش پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنی قوت آزادی سے کام لیتے ہوئے صوبہ جات کی گورنمنٹوں کو اردو دشمنی سے باز رہنے کے لئے مجبور کریں۔

(ریاست دہلی)

گرہیں مکتب ....

پچھلے ماہ کے اواخر میں ریاست بہار کی دونوں یونیورسٹیوں یعنی پٹنہ یونیورسٹی اور بہار یونیورسٹی کی اعلیٰ مجلسوں سینٹ کے جلسے ہوئے۔ بعض کمیٹیوں اور ذیلی شعبوں کی نشستیں کل پرسوں تک ہوتی رہیں۔ ہماری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ وہی لوگ، جو جلسوں، مشاعروں، بزموں اور پلیٹ فارموں پر انصاف پسندی اور علم دوستی کا دم بھرتے ہیں جب علمی محفلوں اور انتظامی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں تو کسی پہلو سے آنکھیں بند کیوں کر لیتے ہیں۔ پہلو کیوں بچانے لگتے ہیں آج سے پانچ سات ماہ قبل بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا ایک وفد بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر شری شیام نندن سہائے سے ملا اور انہیں آگاہ کیا کہ بہار یونیورسٹی میں اکثر کالجوں میں اردو کی تعلیم کا نظم انتہائی ناقص ہے۔ موصوف نے خندہ پیشانی سے وفد کے جذبات کی قدر کا اظہار کیا اور دوسرے تیسرے دن ہی جنرل سکریٹری کو طلب کیا۔ جنرل سکریٹری ان سے تبادلۂ خیال اور ان کے سامنے بعض ٹھوس حقائق رکھے اور عملی مثالیں دیں۔ وائس چانسلر نے ان کو کئی کالجوں کا نام لکھا دیا۔ اور یہ کہہ دیا کہ ان میں یا تو کوئی انتظام کر دیا گیا ہے یا بہت جلد یعنی اسی سیشن کے شروع ہی میں کر دیا جائے گا۔ جب ہماری نظر بڑی اور ہماری توجہ جدول کرائی گئی تو ہم نے سمجھا کہ ان میں سے بیشتر کالجوں میں اردو تعلیم کا کوئی نظم نہ تھا اور نہ اب تک ہے۔ پھر یاد دہانی کی غرض سے ایک لمبا اور طویل میمورنڈم بھیجا گیا اس کی کاپیاں حکومت ہند کی وزارت تعلیمات اور یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کو بھی بھیجی گئیں۔ ان میں خود یونیورسٹی کیلنڈر کے حوالے سے اعداد و شمار دے کر یہ ثابت کیا گیا کہ بہار یونیورسٹی کے ۸۰ فی صدی کالجوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہایت ناقص ہے۔ کوئی بھی ماہر تعلیم اسے پسند نہ کرے گا کہ ایک لیکچرر ہفتہ میں ۳۰ کلاس لے؟ مگر بہار یونیورسٹی میں اردو کے کئی استاد اس پر مجبور کئے جاتے ہیں۔ اور جب انجمن ترقی اردو، اساتذہ، مسلم تنظیم اور اور اسی طرح کے وفود وائس چانسلر سے ملتے ہیں تو وعدہ تو کر دیا جاتا ہے مگر وہ وعدہ فردا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ خدایا! کیا تعلیم گاہوں میں بھی اب سیاسی کھیلوں کو اس حد تک دخل ہو گیا ہے۔

(سنگم پٹنہ)

پرنٹر و پبلشر [illegible] نے نیشنل پرنٹرس کمپنی میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا